پریم چند کے منتخب دلت افسانوں کے اہم مرکزی کردار

ڈاکٹر ہردے بھانو پرتاپ
اسسٹینٹ پروفیسر شعبہ اردو
ذاکر حسین دہلی کالج، دہلی یونیورسٹی

Abstract: Premchand is considered one of the best short story writers in Urdu. His stories are based on Hindustani society even specially Eastern Uttar Pradesh. Where, many inhuman activities were in traditions during his writings period like capitalism, bonded labor, racism, corruption. Premchand had tried to depict all these issues in his short stories. But the most important difficulty was in front of him that in the hierarchy system, how he became able to write these stories making a Dalit character as a main or lead character. In spite of that, Apart from various important social issues of India, Premchand has written excellent fiction on Dalit issues. He is such an Indian writer who has featured Dalit characters as central figures in his creative writings. In this article, I have discussed only those stories in which Dalit characters are portrayed as the main characters. Most of his stories have reflected Dalit issues but the way out of Dalit issues has not been told. In most of his stories, Dalit characters get rid of social ills only by sacrificing their lives. But here is one such story in which Premchand has shown that if Dalit characters develop skills and gain name and fame at the national and international level, it is very possible that they can live a respectable life in Indian society too even being a Dalit.

کلیدی الفاظ: پریم چند، دلت مسائل، سماجی نظام، کہانی، قابلیت، ہنر، گانگی، عفت، نجات، شودر، ٹریجڈی، ہندوستانی عورت، ہندوستانی تہذیب، فرسودہ نظام، صلاحیت۔

پریم چند کا ادبی سرمایہ اتنا وسیع ہے کہ ان پر لکھنے کے لیے جب بھی قلم اٹھاتا ہوں تو کچھ نہ کچھ نیا مل ہی جاتا ہے۔ جبکہ پریم چند کی ادبی جہات و خدمات پر نہ جانے کتنے تحقیقی مقالے مختلف زبانوں میں لکھے جا چکے ہیں۔ اس کے باوجود پریم چند ہر دور میں تحقیق کاروں کے لیے ایک نئے روپ میں ابھر کر سامنے آتے ہیں۔ ان کی تخلیقات ہمارے بدلتے ہوئے معاشرے کے لیے ایک مشعل راہ کی شکل میں ہمیشہ موجود ہوتی ہیں۔ پریم چند کی کل کہانیوں کی تعداد پر بات کرنا اب کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ کیونکہ ماہرین پریم چند نے اب تک ان کی تمام ہندی اور اردو کہانیوں کو یکجا کر کے تقریباً صحیح تعداد کا پتا لگا لیا ہے۔ ڈاکٹر قمر رئیس نے اپنی کتاب پریم چند کے نمائندہ افسانے کے مقدمے میں ان کی کہانیوں کے کل 14 مجموعوں کے حوالے سے بات کی ہے۔ قمر رئیس نے ان 14 مجموعوں میں شائع ہونے والی پریم چند کی کل کہانیوں کی تعداد 195 بتائی ہے۔ حالانکہ انہوں نے یہ بھی ذکر کیا ہے کہ پریم چند کی بہت ہی اہم کہانیاں جس میں روٹھی رانی اور کفن کا ذکر ہوتا ہے۔ وہ ان مجموعوں میں نہیں شامل ہیں۔ انہوں نے یہ بھی واضح کیا ہے کہ ہندی مجموعوں میں شائع ہونے والی ان کی کہانیوں کی تعداد اس سے زیادہ ہے۔ مزید قمر رئیس نے ڈاکٹر جعفر رضا کا ذکر کرتے ہوئے ہندی میں شائع ہونے والی پریم چند کی کہانیوں کے حوالے سے یہ کوٹ کیا ہے کہ ''اس طرح پریم چند کی کہانیوں کی کل تعداد 273 قرار پاتی ہے۔'' (پریم چند کہانی کار رہنما صفحہ نمبر 351)

ہماری بحث یہاں پریم چند کی کل کتنی کہانیاں ہیں اس سے نہیں ہے بلکہ کتنی کہانیاں ایسی ہیں جن میں دلت کرداروں کے حوالے سے گفتگو ہوئی ہے یا ان کو مرکزی کردار کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے۔ ہندی میں ان کی کہانیوں کا ایک کلیات موجود ہے، جس کا عنوان "مانسروور" ہے۔ یہ کل آٹھ حصوں میں تقسیم ہے اور اس میں ان کی کل کہانیوں کی تعداد 224 بتائی گئی ہے، جو کہ ایک مستند تعداد مانی جا سکتی ہے۔ ہندی اور اردو کی دونوں بحثوں کو دیکھ کر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ پریم چند کی کہانیوں کی کل تعداد چاہے 224 ہو یا 273 لیکن ان کی ان تمام کہانیوں میں محض 15 کہانیاں ایسی ہیں جس میں دلت مسائل پر گفتگو ہوئی ہے یا ایک دلت کو مرکزی حیثیت کردار کی حیثیت سے منظر عام پر لانے کی کوشش کی گئی ہے۔ ان کہانیوں کے عنوان کچھ اس طرح سے ہیں؛ ٹھاکر کا کنواں، گلی ڈنڈا، گھاس والی، دودھ کی قیمت، شودر، نیک بختی کے تازیانے، راہ نجات، نجات، آگا پیچھا، کفن، مندر، منتر، لانچھن، موٹھ اور وِدھونس وغیرہ۔ پریم چند کی 15 یہ ایسی کہانیاں ہیں جن میں مرد، عورت، بوڑھا بوڑھی اور بچے کی شکل میں دلت کرداروں کی عکاسی کی گئی ہے۔ پریم چند کا بڑا کمال یہ ہے کہ ہندوستان کے طبقاتی نظام میں جہاں اعلیٰ طبقے کے لوگوں کو اہمیت حاصل تھی، اس کے باوجود انھوں نے دلت کردار کو مرکزی میں رکھتے ہوئے اس کے ذاتی مسائل کے ساتھ ایک بہترین انداز میں پیش کیا ہے۔ اس مضمون میں دلت کردار کے دو رنگ دیکھنے کو ملیں گے۔ ایک تو یہ کہ دلت اپنے مسائل سے جوجھتا ہوا موت کو گلے لگا کر ان مسائل سے نجات پانے کا راستہ نکالتا ہے۔ وہیں دوسری طرف ان کے یہاں دلت کردار نگاری کا دوسرا رنگ یہ ہے کہ وہ خود کو فنا کرنے کی بجائے اپنے اندر قابلیت پیدا کر کے اسی ہندوستانی سماج میں عزت کی زندگی جینا پسند کرتے ہیں۔ گرچہ یہ راستہ آسان نہیں ہے لیکن ایسا کر کے پریم چند نے دلت سماج میں نئے ڈھنگ سے جینے کی امید پیدا کی ہے اور نئی طرز زندگی کا راستہ ہموار کیا ہے۔

گوَرا

شودر افسانے کا مرکزی کردار گوَرا کی زندگی کا سفر اس کی ٹریجڈی کی اصل حقیقت ہے۔ اس کے خاوند کے دل میں پیدا ہونے والا شبہ اس کی زندگی کا خاتمہ

کرتا ہے۔ وہ اتنی خوبصورت عورت ہے کہ اس کی فکر میں اس کی ماں دن بہ دن کمزور ہوتی جاتی ہے۔ اس کا دل کش بدن اور اس کی خوبصورتی لوگوں کے ذہن میں وہم پیدا کرتی ہے جس کی وجہ سے اس کی عفت مشکوک ہو جاتی ہے۔

گورا کی زندگی کی شروعات ایک اتفاق کے ساتھ ہوتی ہے۔ پردیسی منگرو کی نگاہ جب گورا کی خوبصورتی پر پڑتی ہے تو گورا کی خوبصورتی اس کی انکھوں میں رچ بس جاتی ہیں۔ نتیجتاً دونوں کی آپس میں سگائی ہو جاتی ہے لیکن جات پات کا بھید بھاؤ گورا کی خوبصورتی اور اس کی عفت کو مشکوک بنا دیتا ہے۔ منگرو جو گورا کو ایک طویل عرصے کی عبادت کے بعد ملا ہے اسے چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔ ذات پات اور بھید بھاؤ کی وجہ سے منگرو کبھی اسے چھوڑ کر جا سکتا ہے، اس بات سے گورا بالکل بے خبر تھی۔ اس لیے اسے منگرو کے واپس لوٹ آنے کی پوری امید رہتی ہے۔ وہ اپنے منگرو کی محبت میں مانگ میں سندور ڈالتی ہے خوبصورت کپڑے پہنتی ہے۔ اس کی نظر میں منگرو آج بھی محبت کرنے والا ایک ایماندار اور طاقتور انسان ہے۔ یہاں تک کہ منگرو کے بارے میں وہ جتنی بھی بات کرے کم ہے۔ یہاں گورا کا کردار بالکل سَرل اور خوبصورت نظر آتا ہے۔

لیکن گورا کا یہی بھولا پن اس کی زندگی تباہ کرنے کے لیے کافی ہے۔ بھولی گورا کلکتے سے آئے انجان بوڑھے براہمن پر بھروسہ کر کے اس کے ساتھ چلنے کے لیے راضی ہو جاتی ہے۔ کسی کا مستقبل کیسے کوئی جان سکتا ہے۔ بوڑھے براہمن کے ساتھ گورا کا جانا اس کی تباہی کی اور جانا ثابت ہوا۔ راستے میں وہ اپنے خاوند سے ملاقات کے بارے میں جو کچھ بھی تانے بانے بنتی ہے وہ ایک ہندوستانی عورت میں فطری طور پر دیکھی جا سکتے ہیں۔ ایک طویل عرصے کے بعد اچانک شوہر کا سامنے آنا، بیوی کا اس سے روٹھ کر منہ موڑ لینا، ناراضگی ظاہر کرنا، رونا پھر گلے سے لپٹ جانا، اس طرح کے خیالات گورا کے دل میں فطری معلوم ہوتے ہیں۔ جو ہر حال میں ایک عورت کو خوشی فراہم کرتے ہیں۔ لیکن گورا کے نصیب میں خوشی کہاں تھی؟ جو آخر کار کلکتہ پہنچتے ہی اسے سب معلوم بھی ہو گیا۔

کلکتہ پہنچنے پر گورا کو سوائے مایوسی کے کچھ بھی حاصل نہیں ہوا۔ مزید بوڑھے براہمن نے اس سے کہا کہ ابھی کل ہی منگرو یہاں سے کسی جہاز پر بیٹھ کر دور چلا گیا ہے۔ اس کے پاس جانے کے لیے جہاز سے آٹھ دن کا سفر طے کرنا ہو گا۔ پھر کہیں تمہاری ملاقات منگرو سے ہو پائے گی۔ یہ سننا تھا کہ گورا کا دل درد سے بھر گیا اور اسے کسی انہونی کا ڈر ستانے لگا۔ جہاز پر سفر کے دوران ملی عورت اسے مرِچ دیس کی مصیبتوں سے واقف کراتی ہے جس سے گورا بہت ڈر جاتی ہے۔ لیکن جہاز سے اترنے کے بعد منگرو کا دیدار ہوتے ہی وہ منگرو کی باہوں میں جانا چاہتی ہے لیکن سنکوچ کی وجہ سے نہیں جاتی۔

یہاں گورا کا ایک دوسرا روپ لیکن ہندوستانی ناری کی صورت میں ہی دکھائی دیتا ہے۔ جب وہ کہتی ہے کہ بھلے ہی منگرو نے اسے اپنے پاس بلایا ہو لیکن وہ منگرو کے کندھوں پر بھار بن کر نہیں رہے گی۔ لیکن وہ اس بات سے بے خبر تھی کہ جس مقام پر وہ پہنچی ہے وہ جگہ کوئی معمولی جگہ نہیں تھی بلکہ وہاں عورتیں سوائے بھوگ کے سادھن کے اور کچھ نہیں تھیں۔ کسی عورت کا وہاں اکیلا رہنا ناممکن تھا۔ گورا کے اوپر آنے والی مصیبتوں کے بارے میں سوچ کر منگرو سہم سا جاتا ہے۔ اب گورا منگرو کے لیے کسی دیوی سے کم نہیں ہے۔ اس کی عزت بچانے کے لیے وہ دنیا بھر کی ترکیبیں سوچنے لگتا ہے۔ لیکن اس جگہ کی ریت رواج کے مطابق گورا کی عزت کو بچا پانا بہت مشکل کام تھا۔ منگرو اپنی دیوی کی حفاظت کے لیے انگریز شہدوں کی ہنٹروں کی مار کھانا پسند کرتا ہے لیکن وہ کسی بھی صورت میں گورا کو اپنی آنکھوں کے سامنے ان کے پاس جانے دینا پسند نہیں کرتا۔ لیکن یہاں بھی گورا ایک ہندوستانی عورت کے

روپ میں پھر دکھائی دیتی ہے وہ اپنے شوہر کی جان بچانے کے لیے خود کو آگے کر دیتی ہے۔ جس سے ہنٹر کی مار گورا پر پڑے اور منگرو بچ جائے۔ یہاں تک کہ گورا کا قدم یہی نہیں رکتا بلکہ وہ منگلوں کی جان کی خاطر خود کو انگریز صاحب کی کوٹھی میں رکنے اور خون کا گھونٹ پینے کے لیے منا لیتی ہے۔ لیکن قبل اس کے کی انگریز اسے ہاتھ لگائے وہ بہت ہی چالاکی اور خوش اسلوبی سے بولنا شروع کرتی ہے اور یہاں پر پہلی بار گورا کا بیان ایک ناری وادی اور ہندوستانی عورت کے روپ میں اسے منظر عام پر لاتا ہے۔ وہ انگریز کے دل میں محبت اور انسانیت کے جذبات کو بیدار کرنا چاہتی ہے کیونکہ اس کے پاس یہی وہ ہتھیار تھا جس سے کہ وہ انگریز سے خود کو اور خود کے شوہر کو بچا سکتی تھی۔ لہٰذا اس نے جب اچانک سے دیوار پر ٹنگی انگریز صاحب کی ماں کی تصویر دیکھی تو فوراً اس نے اپنا نظریہ اور بیان اس طرف موڑ دیا اور اس نے کہا کہ "۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔تم اس دیوی کے بیٹے ہو کر۔۔۔۔۔۔۔۔" نتیجتاً انگریز اپنے کیے پر گورا سے معافی مانگتا ہے اور اس طرح گورا اپنے شوہر کو بچانے میں کامیاب ہوتی ہے۔ گورا اپنی چالاکی اور سوجھ بوجھ سے سب کچھ صحیح کر دیتی ہے۔ اپنی عفت اور اپنے شوہر کی جان دونوں کو بچانے کے باوجود وہ اپنے ہی شوہر کے مشکوک رویے سے ہار جاتی ہے۔ جب وہ بولتا ہے "صاحب کے بنگلے میں کیا جگہ نہیں ہے؟" منگرو کے اس مشکوک رویے سے گورا کے بدن میں آگ سی لگ جاتی ہے اس کے اپنے خاوند کے یہ الفاظ اس کے دل میں چبھ جاتے ہیں اور آخر کار وہ خود کو مٹانے کا ارادہ کرنے لگتی ہے اور صرف ارادہ ہی نہیں بلکہ ندی میں کود کر وہ خودکشی کر لیتی ہے۔

اس طرح گورا محض ایک دلت عورت ہونے کی وجہ سے مختلف دکھوں اور تکلیفوں کو سہتی ہے۔ وہ ہر موڑ پر اپنی خوبصورتی اپنی عفت اور اپنی مریادہ کو بچائے رکھتی ہے اس کے لیے اسے بہت جدوجہد سے گزرنا پڑتا ہے لیکن اس کی ذات کا دنش اس کا پیچھا آخری سانس تک نہیں چھوڑتا ہے۔ نتیجتاً وہ خودکشی کو ہی ان تمام پریشانیوں سے نجات پانے کا راستہ سمجھتی ہے اور موت کو گلے لگا لیتی ہے۔ یہ صرف ایک گورا کی کہانی نہیں ہے بلکہ تمام خوبصورت دلت عورت کی کہانی ہے جو ہندوستانی سماج میں مختلف مصیبتوں کا سامنا اپنی روزمرہ کی زندگی میں آئے دن کرتی ہیں۔

نتھوا

اگر انسان وقت کا صحیح استعمال کرے تو آسمان کی بلندیاں بھی چھو سکتا ہے۔ خواہ وہ سماجی دنیا میں کسی بھی طبقے سے تعلق رکھتا ہو۔ افسانہ سوبھاگیہ کے کوڑے کا مرکزی کردار یتیم نتھوا رائے صاحب کے کوڑے کی مار کھا کر جس بنگلے سے بھاگتا ہے، آخر کار ایک دن رائے صاحب کے اسی بنگلے میں اُن کا جمائی بن کر واپس لوٹتا ہے۔ یہ اس کے کردار کی کامیابی اور ترقی کی انتہا ہے۔ یتیم نتھوا کا بچپن رائے صاحب کی جوٹھن، ان کے بچوں کے پہنے ہوئے کپڑے اور رائے صاحب کے رحم و کرم پر گزرتا ہے۔ بدلے میں وہ رائے صاحب کے گھر میں جھاڑو لگاتا ہے۔ دوسرے نوکر بھی اسے حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں اور بھنگی جیسے الفاظ سے مخاطب ہوتے ہیں۔ ان سب باتوں سے یتیم نتھوا کو کوئی فرق نہیں پڑتا۔

لیکن نتھو کی زندگی میں اصل موڑ تب آیا جب اس نے رتنا کی پلنگ پر لیٹنے کی جرأت کی۔ ہوایوں کی ایک دن جھاڑو لگاتے ہوئے نتھوا کی نظر رتنا کے نرم موٹے گدے دار بستر پر گئی۔ رتنا کے پلنگ کی خوبصورتی نتھو کو اپنی طرف مدعو کر رہی تھی۔ لہذا نتھوا اس جنت کا لطف لینے کے لیے پلنگ پر لیٹ گیا۔ اس پلنگ پر لیٹنے سے نتھوا کو جو خوشی میسر ہوئی وہ کسی جنت کو حاصل کرنے سے کم نہ تھی۔ پھر اسے فوراً اپنے دلت ہونے کا بھی احساس ہوتا ہے اور وہ اپنے خیالوں میں جنت کی سیر کو روک لیتا ہے۔ لیکن پلنگ پر لیٹنا اس کی زندگی کی سب سے بڑی سزا ثابت ہوئی۔ رائے صاحب نے اسے پلنگ پر لیٹے ہوئے دیکھ

لیا۔ رائے صاحب نے ہنٹر سے نتھوا کی جو پٹائی کی کہ اس کا جسم بے جان ہو گیا۔ نتھوا نے ادھمرے جسم کی حالت میں رائے صاحب کے بنگلے کو ہمیشہ کے لیے الوداع کہہ دیا۔ رائے صاحب کی اس مار کو نتھوا کبھی بھی بھلا نہیں سکتا تھا۔ لہذا یہ مار نتھوا کو اپنی زندگی میں آگے بڑھنے کے لیے مجبور کرنے لگے۔

آخر کار نتھو کی بے چینی اس کے لیے راہ ہموار کرتی ہے۔ نتھوا اپنی سوجھ بوجھ سے کام لیتا ہے۔ وہ کوئی آسان راہ نہیں چاہتا۔ وہ محنت کرنا جانتا ہے اور اپنے لیے ایک نئی راہ بنانا چاہتا ہے۔ لیکن یہ سب کرنے کے لیے اسے اپنے پیچھے ایک سپورٹ کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ لہذا وہ اپنے سماج کے لوگوں کے درمیان جانا پسند کرتا ہے۔ جہاں اسے گائکی کے فن میں ترقی کرنے کا موقع ملتا ہے۔ جس میں اسے آسمان کی بلندیاں حاصل ہو جاتی ہیں۔ پریم چند اس کے اس فن کی تعریف اس طرح کرتے ہیں "..... گانا، شہنائی بجانا، پکھاوج، سارنگی، تمبورا، ستار، یہ سبھی باجے بجانا جانتا تھا۔ استادوں کی اس کی معجزہ خیر دانائی پر تعجب ہوتا تھا....." استادوں کی نظر میں نتھوا ایک ہیرے کے جیسا بن گیا تھا۔

نتھوا کی شہرت دور دراز علاقوں میں پھیلنے لگی۔ یہاں تک کہ گوالیئر کے ایک سمیلن میں اسے سونے کا تمغہ انعام میں حاصل ہوا۔ اور گوالیئر کے سنگیت اسکول میں پانچ سالوں میں اسکول کی اعلیٰ مقام کو حاصل کر کے وہ اپنے لاسانی فن کا مظاہرہ کرتا ہے جس سے وہ سماج میں زیور کی مانند بن جاتا ہے۔ اب اس میں سوچنے سمجھنے کی صلاحیت بھی بیدار ہو چکی تھی۔ وہ اپنی عزت واحترام کا بھی خیال کرتا ہے اور وہ اپنا رویہ بھی اونچے خاندان کے لوگوں کے جیسا بنا کے رکھتا ہے۔ اس طرح وہ اب نتھو رام سے نا۔ را۔ آچاریہ کی حیثیت سے مقبول عام ہو گیا۔ یہاں تک کہ راج درباروں سے اسے اچھی تنخواہ بھی ملنے لگی۔ نتھو نے یہ سب کچھ محض 18 برس کی عمر میں حاصل کر لیا۔

اس کی محنت اور لگن کی پیاس صرف ہندوستانی گیتوں تک محدود نہیں رہی۔ وہ مغربی سنگیت میں بھی مہارت حاصل کرنے کے لیے جرمنی سے سنگیت میں آچاریہ کی پدوی لے کر اِٹلی کا سفر کرتے ہوئے آخر کار لکھنو میں مقیم ہوتا ہے۔ پریم چند نے نتھو کے کردار کو ترقی دینے اور ایک نئی صورت میں دکھانے کے لیے اِتفاقی عناصر سے بہت حد تک کام لیا ہے۔ مثلاً نتھوا کا رائے صاحب کی کوٹھی سے بھاگ جانا اور پھر اپنے سماج کے لوگوں کے درمیان جا کر گائکی کی تعلیم حاصل کرنا اور نتھو رام سے نا۔ را۔ آچاریہ تک کا سفر طے کرنا اور پھر مغربی ممالک کا سفر طے کرتے ہوئے لکھنؤ میں آکر مقیم ہونا، جہاں پر اسی رائے صاحب کی کوٹھی ہے جن کے یہاں سے نتھوا بچپن میں کوڑے کی مار کھا کر بھاگا تھا۔ یہ سب محض ایک اتفاق ہی تو ہے اور اس سے بھی بڑا اتفاق وہاں نظر آتا ہے جب نتھو کی شادی رتنا سے ہو جاتی ہے۔

لکھنو میں آچاریہ کا جہاں ایک طرف شاندار استقبال ہوتا ہے وہیں دوسری طرف رتنا کو سامنے کھڑی پا کر اس کے بھی پیر کانپنے لگتے ہیں۔ انہیں اس بات کا ڈر ستانے لگتا ہے کہ کہیں رائے صاحب کو یہ نہ پتا چل جائے کہ آچاریہ کوئی اور نہیں بلکہ وہی بچپن کا بھاگا ہوا نتھو ہے۔ مثلاً ایک دلت انسان دنیا بھر میں کتنا بھی نام کما لے کتنا بھی اونچا مقام حاصل کر لے لیکن جب وہ اپنی ذات کے کرب کو محسوس کرتا ہے تو اس کے دل میں ایک ڈر پیدا ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کی آچاریہ جی کے رہنے کا انتظام جس بنگلے میں ہوا ہے وہ کوٹھی رائے صاحب کی ہی ہے۔ جہاں رتنا کا پلنگ دیکھ کر ان کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ رتنا سے شادی کی بات ہونے پر وہ غور و فکر میں پڑ جاتے ہیں۔ یہاں پر آچاریہ کا ذہنی کشمکش میں مبتلا ہونا فطری ہے۔ آج بھی ان کے پاس اتنی ہمت نہیں ہے کہ وہ اپنی اصلیت ظاہر کر سکیں۔

لیکن یہاں پر کہانی کار نے ایک اچھا طریقہ یہ اپنایا ہے کہ رتنا کو اس انداز سے بیان کیا ہے کہ رتنا آچاریہ کی حقیقت کے بارے میں سب جانتی ہے اور اس بات سے اسے کوئی دقت نہیں ہے۔آچاریہ سے رتنا کی شادی سماج میں پھیلی غیر برابری کو دور کرنے کا ایک راستہ ہے۔ مجموعی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کہانی میں نتھوا کا کردار اپنی قسمت کی خوبیوں سے بھرا ہے یہی وجہ ہے کہ جس پلنگ کی وجہ سے اسے رائے صاحب کا بنگلہ چھوڑنا پڑا تھا آج اس کی قسمت نے اسی پلنگ پر اسے ایک جمائی کی صورت میں بھیجا ہے۔ یہ قسمت کی خوبی اور بلندی نہیں تو پھر اور کیا ہے۔

دُکھی

دکھی پریم چند کا افسانہ نجات کا مرکزی کردار ہے۔ گرچہ اس افسانے میں دکھی کے علاوہ اس کی بیوی جھریا بھی موجود ہے۔ لیکن پوری کہانی کا تانا بانا دکھی کے ارد گرد گھومتا ہے اس لحاظ سے اس افسانے کا مرکزی کردار دکھی ہے۔ پریم چند کے کسی افسانے میں مرکزی کردار ایک ہیرو کے مانند طاقتور اور سڑے گلے نظام سے بغاوت کرنے والا دکھائی دیتا ہے تو وہیں دوسرے افسانے میں پریم چند کا مرکزی کردار ہندوستانی سماج کے بنائے ہوئے فرسودہ رواجوں کی جکڑ میں بے بس اور لاچار اپنی جان دینے کو مجبور دکھائی دیتا ہے۔ دکھی پریم چند کے دوسرے مرکزی کرداروں کی طرح ہے جسے فرسودہ رسموں کی پاسداری میں اپنی جان گوانی پڑتی ہے۔ کیونکہ اس افسانے کا مرکزی کردار دکھی توہم پرستی کا شکار ہے۔ جس کی وجہ سے وہ پنڈت گھاسی رام سے ساعت شگون پوچھنے جاتا ہے اور اس کا یہ کارنامہ ہی اس کا خاتمہ کر دیتا ہے۔افسانے کے آغاز میں ہی دکھی کی زبان سے ادا ہونے والے الفاظ دلت سماج کی حقیقت بیان کرتے ہیں۔ دلت انسان کی طرح ہی دلتوں کا سامان بھی اچھوت معلوم پڑتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ توہم پرست دکھی پنڈت جی کے آنے سے قبل اُن کے بیٹھنے اور انہیں سیدھا دینے کے تمام انتظامات کے بارے میں اپنی بیوی سے ذکر کرتا ہے۔ وہ پنڈت جی کے خاطر تواضع میں ہر ممکن کوشش کرتا ہے یہاں تک کہ پنڈت جی کو ان کے گھر بلانے جاتے وقت اپنے سر پر گھاس کا ایک گٹھر بھی لے جاتا ہے تاکہ پنڈت جی خوش ہو جائیں اور اس کا کام کر دیں۔

اس افسانے میں پریم چند کا مرکزی کردار اپنے نام کے اصل معنی کی ادائیگی پوری طریقے کرتا ہے۔ جس طرح اس کا نام دکھی ہے اسی طرح وہ سچ میں دین ہین ہے۔ وہ پنڈت جی کو دیوتا مانتا ہے اور ان کے سامنے اپنے آپ کو بالکل کمزور اور ذلیل انسان سمجھتا ہے۔اور آخر کار خود کو اتنا کمزور پاتا ہے کہ اس کی جان نکل جاتی ہے۔ جب کہ وہ اپنے تمام کاموں میں فرتیلا ہے اور پنڈت جی کے یہاں پہنچنے پر ان کی گایوں کو گھاس ڈالنا، دروازے پر جھاڑو لگانا، بیٹھک کو گوبر سے لیپنا اور یہاں تک کہ بھوسا بھی پھٹا پھٹ ڈھو کر گھر میں رکھ دیتا ہے۔ وہ اپنا کام اچھی طرح کرتا ہے لیکن اس کی سدھ لینے والا وہاں کوئی نہیں ہے، بلکہ ایک کے بعد دوسرا کام دینے کے لیے پنڈت جی تیار بیٹھے ہیں۔ جب کچھ نہیں بچا تو اسے لکڑی کی گانٹھ ہی چیرنے کے لیے دے دیا گیا۔اور دکھی بیچارہ پنڈت جی کے ڈر سے، ان کی قد و قامت، ان کی پنڈتائی کے ڈر سے خالی پیٹ ہی لکڑی پھاڑنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ پریم چند لکھتے ہیں کہ "پنڈت جی بھوجن کرنے چلے گئے۔ دکھی نے صبح سے کچھ نہیں کھایا تھا۔ اسے بھی زور کی بھوک لگی تھی لیکن وہاں کھانے کو دھرا ہی کیا تھا؟ گھر یہاں سے میل بھر تھا۔ وہاں کھانے چلا جائے تو پنڈت جی بگڑ جائیں۔ بیچارے نے بھوک دبائی اور لکڑی پھاڑنے لگا۔" دکھی کا کردار قدم قدم پر دکھ سہنے والا ہی ہے۔ دکھی مذہبی اقدار کی پاسداری کرنے والا ہے لیکن ایسے پاسداری کا کیا جو اسے بھوکے پیٹ کام کرنے پر مجبور کرے۔ اور اسے اپنے حقوق کے لیے بولنے کی

طاقت میں نہ عطا کرے۔اس کا بھولا پن اس کی جان لینے پر تلا ہوا ہے۔"ہاتھ اٹھائے نہ اٹھتے تھے۔پاؤں کانپ رہے تھے۔ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔پھر بھی اپنا کام کیسے جا رہا تھا۔"

غریبی اور سماجی بے دخلی نے دکھی کو اس طرح جکڑ رکھا تھا کہ اپنے لیے بھی بغاوت کرنے کی اس میں ذرا بھی تاب نہ تھی۔وہ اس طرح شکار ہو چکا ہے کہ ہر جگہ خود کو ہی گنہگار سمجھتا ہے۔یہاں تک کہ جب اسے تمبا کو پینے کا خیال آتا ہے تو اس میں بھی وہ یہی سمجھتا ہے کہ براہمن تمبا کو نہیں پیتے ہیں۔تما کو میں پیتا ہوں اور یہ میری کمزوری کی نشانی ہے۔اس کے کردار میں چھوا چھوت کا بھی دباؤ اس قدر رچا بسا ہوا ہے کہ وہ جھریا کو سخت ہدایت دیتا ہے کہ پنڈت جی کو سیدھا دیتے وقت بہت خیال رکھنا ہے کہیں غلطی سے وہ چھو نہ جائیں۔اور پھر چلم پینے کے لیے آگ مانگنے پر پنڈتائن کی زبان سے جو برے الفاظ نکلتے ہیں اس وقت بھی اسے اپنے دین ہین ہونے کا احساس ہوتا ہے اور جب پنڈتائن کے آگ پھینکنے کی وجہ سے وہ جل جاتا ہے تب بھی اسے یہی لگتا ہے کہ اس کے گناہوں کی سزا اسے یہی مل گئی۔

دکھی بے وقوف تو نہیں ہے لیکن وہ لاعلمی کی حالت میں سماجی بندھنوں میں اس کا جکڑا ہونا فطری ہے اور مذہبی بندھنوں نے اسے اس قدر بھولا بنا دیا ہے کہ وہ اس سے آگے اپنا ذہن لگا ہی نہیں پاتا۔کیونکہ دکھی جہاں کہیں تھوڑی بھی ہمت کر کے اپنی سہولت کے مطابق کچھ کرنا بھی چاہتا ہے تو پنڈت جی کی ڈانٹ ڈپٹ اور بری ساعت نکالنے کا ڈر اسے پنڈت جی کے کہے مطابق کام کرنے پر مجبور کر دیتا ہے۔اچھی ساعت نکلوانے کے جوش نے اسے ایسی طاقت عطا کی کہ اس نے آخر کار گانٹ والی لکڑی چیر ہی ڈالی لیکن ساتھ ہی وہ بھی چکّر کھا کر زمین پر گر گیا اور پھر کبھی نہیں اٹھا۔اس مرکزی کردار کے ساتھ سب سے دکھ کی بات یہ ہے کہ سماجی بندھن اس کا پیچھا اس کے مرنے کے بعد بھی نہیں چھوڑتے۔کیونکہ ہندو شاستروں میں کہیں نہیں لکھا ہے کہ ایک دلت کی لاش کو کبھی پنڈت ہاتھ لگائے گا۔نتیجتاً مرنے کے بعد پنڈت جی اسے رسّی سے باندھ کر گھسیٹتے ہوئے میدان میں چھوڑ آتے ہیں جہاں چیل کوّے اس کی لاش کو نوچتے پھرتے ہیں۔دکھی کی مذہبی رواداری کا یہی انعام تھا۔

پریم چند کے بیشتر افسانوں میں دلت کرداروں کی سماجی حیثیت نہایت ہی قابل مذمت ہے۔اس مضمون میں تین کہانیوں کے مرکزی دلت کرداروں کی کہانی بیان کی گئی ہے۔جن میں ابتدا میں تینوں کرداروں کی حیثیت ایک جیسی ہے لیکن کہانی کے اختتام تک آتے آتے ان تینوں کرداروں میں سے ایک کردار نتھوا کی قسمت بدل جاتی ہے۔وہ نتھوا سے نا۔را۔آچاریہ بن جاتا ہے۔جبکہ گورا اور دکھی آغاز سے انجام تک ہزار ہا مصیبتوں میں گھرے رہتے ہیں اور ان کے انتقال کے بعد ہی انھیں اس دنیاوی تکالیف سے نجات حاصل ہوتی ہے۔نتھوا اور گورا و دکھی میں محض ایک فرق واضح طور پر نظر آتا ہے اور یہ کہ نتھوا اپنے اندر قابلیت پیدا کرتا ہے وہ قسمت اور قدرتی طور پر حالات بدلنے کی فراق میں نہیں رہتا ہے۔وہ ہندوستان سے گانگی کا تعلیمی سفر شروع کرتا ہے اور مغربی ممالک سے گانگی کے نئے نئے ہنر سیکھتے ہوئے ہندوستان لوٹتا ہے۔اسی ہندوستانی سماج میں جہاں اس کی محض ایک چھوٹی سی غلطی کی وجہ سے کوڑوں کی بوچھار کا سامنا کرنا پڑا تھا۔آج وہ اسی سماج میں اپنی قابلیت کی بنا پر اسی کوٹھی میں ایک جمائی کی حیثیت سے داخل ہوتا ہے۔جب کہ گورا اور دکھی کے اپنی جان دینے کے بعد ہی سماجی دکھوں سے نجات فراہم ہوتی ہے۔اس کا مطلب یہ ہوا کہ پریم چند نے نتھوا کے ذریعے کہیں نہ کہیں دلتوں کے لیے

ایک راہ ہموار کرنے کی کوشش ہے اور وہ ہے ان کی قابلیت۔ اگر دلت کرداروں کے اندر قابلیت پیدا ہو، خواہ وہ اعلیٰ تعلیم کے ذریعے ہو یا پھر کسی فنون لطیفہ کے ذریعہ۔ یہی وہ راہ نجات ہے جس سے دلتوں کی زندگی میں ایک اہم تبدیلی آسکتی ہے۔

حواشی

۱۔ رئیس، ڈاکٹر قمر۔ پریم چند کے نمائندہ افسانے۔ ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ۔ ۱۹۹۶

۲۔ رضا، ڈاکٹر جعفر۔ پریم چند: کہانی کار ہنما۔ رام نراین لال بینی مادھو، کٹرہ روڈ الہ آباد۔ ۱۹۶۹

۳۔ رئیس، ڈاکٹر قمر۔ پریم چند فکر و فن۔ پبلیکشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی۔ ۱۹۸۰

۴۔ گوپال، مدن (مرتبہ)۔ کلیات پریم چند جلد ۱۴، ۱۳، ۱۲، ۱۱، ۱۰، ۹۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی۔ ۲۰۰۰

۵۔ انجینئر، اصغر علی۔ پریم چند: حیات اور فن۔ این سی ای آر ٹی، نئی دہلی۔ ۱۹۸۱

۶۔ پریم چند۔ مانسرور۔ جلد ۱ تا ۸۔ آن لائن ہندی کوش (انٹرنیٹ آرکائیو)

☆☆☆